جناب عبدالرحمٰن محسن انصاری

قرآن کریم ـــــ عظیم ادب کا معیار

قرآن کریم قیامت تک کے لیے ایک معجزہ ہے۔ وہ اس وقت بھی ایک معجزہ تھا جب اہل عرب کے درمیان نبی امّی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہو رہا تھا اور آج بھی معجزہ ہے جب انسان خلاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ قیامت تک کے لئے ہے کہ

ام یقولون افتراہُ ط قل فاتوا بسورۃٍ مّثلہٖ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین ۝ (یونس ۳۸)

"اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی یہ قرآن خود بنا کر لایا ہے تو ان سے کہہ دو کہ اس کی ایک ہی آیت کے مثل کوئی کلام بنا کر لاؤ۔ اور اس کام میں اللہ کے ماسوا تم جن کو پکارتے ہو ان سب کی مدد لے لو، پھر دیکھیں تم کتنے سچے ہو۔"

انسانی کلام کے مقابلے میں تمام صحفِ آسمانی کی ایک الگ شان ہے مگر تمام صحفِ آسمانی میں بھی قرآن ممتاز ہے قرآن کے آگے فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ شعراء نے اعتراف عجز کر لیا۔ قرآن کے مقابلے میں ان کا عاجز ہونا کس بنا پر تھا؟ قرآن کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر۔ شعریت قرآن کی آیت آیت میں بسی ہے اور یقیناً حق بحث سے بالاتر تھا۔ حق و صداقت، موعظت و حکمت، تذکیر و تبشیر، تاریخی واقعات، اَن دیکھے حقائق سب اس طرح ساتھ ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ جن کے پڑھنے اور سننے سے طبیعت کبھی نہیں اکتاتی۔ اس کا اثر پورے انسانی وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کے الفاظ زیر و بم شیرینی اور اثر آفرینی کا جواب نہیں وہ پڑھنے اور سننے والوں پر بے خودی طاری کر دیتا ہے۔ کبھی اس کا بیان لرزہ بر اندام کر دیتا، کبھی رلا دیتا۔ اور کبھی کیف و انبساط میں غرق کر دیتا ہے۔ قرآن کی عظمت اور اثر کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یقیناً اگر وہ پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی خشیت الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ انسانی قلوب کا کیا ذکر ہے جس طرح قرآن کی کسی ایک آیت کا انکار کرنا کفر ہے اسی طرح قرآن کی آیتوں کی ادبی عظمت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔

قرآن کوئی مسلسل تقریر یا منضبط کتاب نہیں۔ اس کا اسلوب بے نظیر ہے اس میں عقائد بھی ہیں۔ حکایتیں اور

تمثیلیں بھی۔ عبرت آموزی بھی۔ دعوت مشاہدہ بھی۔ ڈراوا بھی۔ خوشخبری بھی۔ غرض مضامین کی تکرار ہر بار ایک نئے معنی اور نئے لطف کے ساتھ۔ اس کے بیان کی تازگی کبھی نہیں جاتی۔ اس کے باغ میں ہمیشہ ایک بہار بے خزاں ہے۔ اس کا اثر جاودانی ہے۔ وہ ہمیشہ قلب و روح کے لئے غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کا ادب حق ہے۔ اور اس کے ہر اسلوب سے حق کا اثبات ہوتا ہے۔ وہ حق جس کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ یعنی اللہ ہے وہی اول ہے۔ وہی آخر۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن۔ اس کی ربوبیت، علم، انصاف، حکمت اور قوت پر کائنات کی ہر شے شاہد ہے۔ عقیدۂ توحید قرآن کے تمام عقائد کی جان ہے۔ شرک اس کے نزدیک ظلم عظیم ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر شے سے توحید باری تعالیٰ کا اثبات ہو رہا ہے۔ قرآن اپنے ہر مومن کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے اعمال و افکار بھی توحید کے مطابق ہوں۔

انسان قدرت خداوندی کا سب سے بڑا مظہر ہے تمام مخلوقات میں اس کے اشرف ہونے کا سبب قرآن نے یہ بیان فرمایا:-

الرحمٰن علّم القراٰن ہ خلق الانسان علّمه البیان ہ (الرحمٰن)

نہایت مہربان خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔

علم بیان سے انسان کا بہرہ ور ہونا اللہ کی عظیم بخشش ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس عطیۂ خداوندی میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی اور جاندار مخلوق کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان ہی رکھتا ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اسی سے تصور و تخیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کا علم ان سب عطیات عقلی کا ستراج ہے اور وہ براہ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفت بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائج فکر اور عقلی قوتوں کا اظہار نہ کر سکتا تو بے شمار علوم و فنون معرض وجود میں آتے۔ نہ حکمت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوس انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذات الٰہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تمام تعریف کا وہی سزاوار ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

ولو انّ ما فی الارض من شجرۃٍ اقلامٌ والبحر یمدّہ من بعدہ سبعۃ ابحرٍ ما نفدت کلمات اللہ ط ان اللہ عزیزٌ حکیم ہ (لقمان ۲۷)

"زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہوں گی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

ھو اللہ الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنیٰ ط یسبح له ما فی السموٰت والارض وھو العزیز الحکیم ٥ (حشر ۲۴)

"وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

چنانچہ انسانوں کو بھی حکم دیا گیا:۔

سبح اسم ربك الاعلی ٥ الذی خلق فسوّی ٥ والذی قدّر فھدیٰ ٥ (الاعلیٰ ۱-۳)

"(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا۔

قل من یرزقکم من السماء والارض امن یملك السمع والابصار ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ومن یدبر الامر ط فسیقولون اللہ ج فقل افلا تتقون (یونس ۳۱)

"ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) کیوں پرہیز نہیں کرتے۔"

قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادیٔ عمل ہی کی بنا پر انسان کو لائقِ جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے

انّما یتذکّر اولوا الالباب ٥ (الزمر ۹)

"نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔"

انسان کی فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے لو لگانے سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیقِ آدم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

الستُ بربکم قالوا بلیٰ (الاعراف ۱۷۲) "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"

اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل میں انسانوں کی روحوں سے فرمایا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"

انہوں نے جواب دیا بیشک تو ہے۔

اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفسِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں

البتہ اس کے لئے دیدۂ بینا درکار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:-

وکاین من آیۃٍ فی السّمٰوٰت والارض یمرّون علیھا وھم عنھا معرضون ۰ (یوسف ۱۰۵)

"زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔"

اللہ کی نشانیوں کے مشاہدے سے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے۔ ان پر غور و فکر کرنے سے ایمان راسخ اور عمل پائیدار ہوتا ہے۔

مظاہرِ فطرت اللہ کی نشانیاں ہیں۔ قرآن نے مناظرِ فطرت کا بہت مقامات پر خوبصورت الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنّہار والفلک التی تجری فی البحر
بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من مّاءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتہا
وبثّ فیہا الخ (البقرہ ۱۶۳/۱۶۴)

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں۔ بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اسی کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔"

ایک دوسری مثال:-

والارض وضعہا للانام ۰ فیہا فاکہۃ ۰ والنخل ذات الاکمام ۰ والحبّ ذوالعصف و
الرّیحان ۰ تا کالاعلام

زمین کو اس نے مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی اس نے دو سمندروں کو چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے

وہ تجاوز نہیں کرتے پس اے جن وانس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اٹھے ہوئے ہیں۔"

یہ زمین و آسمان بیکار نہیں بنائے گئے۔ زندگی بے مقصد نہیں۔ مظاہر حیات گورکھ دھندا نہیں۔ کائنات اندھی قوتوں کی جولان گاہ نہیں۔ انسان نے عالم فطرت کا مشاہدہ کر کے اشیا کے اندر ایک مشترک قانون دریافت کیا۔ اور اس کا نام قانونِ فطرت رکھا۔ قانونِ فطرت بھی دراصل اللہ ہی کا حکم ہے۔

انّما اذا اراد شیئًا ان یّقول لہ کن فیکوْن ○ (یٰس ۸۲)

"وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔"

قرآن نے صاف طور پر آگاہ کیا کہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی۔

وما خلقنا السموات والارض وما بینھما لٰعبین ○ ما خلقنٰھما الّا بالحق ولکن اکثرھم لا یعلمون ○ (الدخان ۳۸-۳۹)

"آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔"

یہ نہ جاننے والے مشرکین و ملحدین ہیں جنہوں نے اپنے نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ وہ اپنی کجرویوں کو فلسفیوں کا نام دیتے ہیں۔ باطل نے کیا کیا فلسفہ آرائیاں کی ہیں۔ مگر قیاس و گمان حق سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ یونان والے لاتعداد دیوی دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی حال اہل ہند کا ہے۔ ہر مظہر فطرت کے لئے ان کے پاس ایک دیوی یا دیوتا ہے اور حاجت روائی کے لئے الگ الگ دیوتاؤں کو پوجا جاتا ہے۔ ایک فلسفہ کی رو سے کائنات میں مادہ کی مقدار محدود ہے اور فطرت اسی محدود مادے سے اشیا کی تخلیق و صورت گری کرتی ہے۔ چنانچہ اشیا اسی لئے مٹی میں مل جاتی ہیں اور پھر مٹی میں نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ مسلسل تخلیق کے راز کو نہ پاکر عقیدۂ تناسخ ایجاد ہوا جو ہر تخلیق کو ایک سابقہ تخلیق کا اعادہ سمجھتا ہے۔ اس طرح مسلسل ایک قالب کے بعد دوسرا قالب اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ شجر و حجر کی پرستش تو کھلی ہوئی بت پرستی ہے۔ بت پرستی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہ اعتقاد بھی اس کی ایک شکل ہے کہ زمانہ ہی قادر مطلق ہے وہ جلاتا اور مارتا ہے قرآن نے بالتصریح یہ فرمایا

وقالوا ما ھی الا حیاتنا نموت ونحیا وما یھلکنا الّا الدھر؟ وما لھم بذالک من علم؟ ان ھم الا یظنون (الجاثیہ ۲۴)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری زندگی ہے یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے۔ اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں۔"

اسی طرح اکابر رجال کو الوہی درجہ دینا جس کا ہمارے زمانے میں عام رواج ہے کہ با اقتدار سیاسی رہنماؤں اور حاکموں کے مجسمے نصب کئے جاتے ہیں اور ان کی تصویریں گھروں دفتروں اور عوامی جگہوں پر آویزاں کی جاتی ہیں۔ یہ سب بت پرستی کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح سائنس، آرٹ اور ایجادات کو وہ درجہ دینا جو خدا کو دینا چاہیئے۔ انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بنا پر وہ خدا سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اسے اس غلط میں مبتلا کرنے والے ایسے دانشور بھی ہیں جو دنیاوی زندگی کو مطمح نظر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سیاسی جابر نظام ایسے دانشوروں کو اپنے نظام کی مداحی پر مامور کرتا ہے۔ الحادی نقطہ نظر چاہتا ہے کہ مجرد "زندگی" کے آگے تمام عقیدت و محبت کے جذبات پیش کئے جائیں۔ وہ زندگی کو الٰہ کا درجہ دے کر عبودیت اور آخرت کے تصورات کو مٹانا چاہتا ہے۔ حالانکہ دنیاوی زندگی سے اس کے غم اور زوال کو ہرگز جدا نہیں کر سکتے۔ ملحد شعراء و ادبا دنیاوی زندگی کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کر کے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ بس یہی دنیاوی زندگی سب کچھ ہے۔ زندگی بعد موت ایک واہمہ ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کا ترانہ اتنی اونچی لے سے گاتے ہیں کہ انسان کے باطن میں جو عالم آخرت کا ایک احساس ہے وہ دب کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعر و نغمہ سے ان کی وہ سروری صفت جو کسی دوسرے عالم کا پتہ دیتی ہے چھین کر ان سے دنیاوی زندگی کی حمد و تسبیح کا کام لیتے ہیں۔ عوام کی بھلائی کی فکر کرنا۔ ان کے لئے کھانا کپڑا اور مکان مہیا کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض ہے۔ مگر "معیار زندگی" کو اپنی تمام مساعی کا ہدف بنا کر آخرت کو فراموش کر دینا بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے۔

قرآن دنیاوی زندگی کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے:۔

اِعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعبٌ ولھوٌ وزینۃٌ وتفاخرٌ بینکم وتکاثرٌ فی الاموال و الاولاد (الحدید ۲۰)

"خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے"

سائنس غیر شخصی ہوتی اور اس کا طرز فکر معروضی ہوتا ہے۔ جب کہ شعر و ادب کی بنیاد جذبہ و احساس پر ہے۔ ادیب کے عقائد و رجحانات اس کے ادب کو رنگ دیتے ہیں۔ وہ اپنی پیش کش میں تنظیم فکر و خیالات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ مگر وہ حقائق کا دماغ سے زیادہ قلب سے ادراک کرنا سکھاتا ہے ادب و شعر یکسر معروضی نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ادب کو ادب رہنے دینے کے لئے یہ ضروری ہے۔ انسان ہمیشہ مظاہر کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کی جستجو کرتا رہا ہے۔ روح انسانی مظہر و صورت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ حکمت مظاہر و صور میں معنی کی تلاش،

ہے۔ روحِ انسانی "جو ہے" پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ "کیا ہونا چاہئے" کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے اور اس کی یہ سعی پیہم زندگی اور صحت کی علامت ہے۔ شعر و ادب میں علامات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عام خیال اور عالم روحانی کے کوائف و مشاہدات کا بیان اسی طرح ممکن ہے کہ ان دیکھی چیزوں کا بیان دیکھی ہوئی چیزوں کی مدد سے کیا جائے لطافتوں کے بیان کے لئے الفاظ کی ثقافتوں سے دامن بچانا مشکل ہے۔ ایک طرح سے مظاہر فطرت اور زندگی خود علامات ہیں حقیقت ان کے پیچھے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فریب و التباس ہے۔ نہیں۔ وہ اتنے ہی حقیقی ہیں جتنے ہمارے شعور و احساس۔ ہماری زندگی۔ ہماری آرزوئیں۔ ہمارے خواب۔ البتہ وہ بھی فانی ہیں اور ہم بھی فانی۔ لیکن یہ حیاتِ گذراں۔ یہ عالم خارجی سے ہمارا ربط، ہماری فتح و شکست، ہماری خوشی اور ہمارے غم۔ یہ سب پل ہیں جن پر سے گزر کر ہم ایک حیاتِ ابدی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ یہ عظیم تر زندگی ہمارے باطن میں ہے۔ اور وہ کامل طور پر ہماری ہو سکتی ہے جب ہم اس عارضی زندگی کے فرائض ان اصولوں کے مطابق انجام دیں جن کی طرف اشارہ ہماری فطرت کرتی ہے۔ اپنی نادانی میں انسان عالم فطرت کا جلال و جمال دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اور ذاتِ خداوندی کی قدر کرنے سے قاصر رہا۔ وہ واہموں میں گرفتار ہو کر غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے معقولیت کو اس امر پر منحصر سمجھ لیا کہ جو آنکھوں سے دیکھا جائے وہی مانا جائے۔ مگر انسان کے حواس خمسہ کی محدودیت ظاہر ہے۔ قرآن کا ذاتِ خداوندی کے متعلق ارشاد ہے۔

لیس کمثلہٖ شیئٌ

"اس کی مانند کوئی شے نہیں"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر (الانعام ۱۰۳)

"نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے"

چنانچہ اس دنیا میں دیدارِ خداوندی ناممکن ہے اور وہ عالمِ آخرت میں ان کو حاصل ہو گا۔ جو اس امید میں دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار مقامات پر بیان ہوئی ہیں ہر جگہ ایک نئے مفہوم کو سمجھانے کے لئے اور زیادہ گہرے معنی کے ساتھ، قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے کہ کوئی بات کہنے کے بعد کوئی حکم دینے، کوئی ممانعت کرنے، کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے یا تزکیہ و تربیت کی تعلیم دینے کے بعد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ جیسے اللہ حکیم ہے۔ علیم ہے۔ خبیر ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے وغیرہ۔ دراصل اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس حکم، واقعہ، تعلیم یا موعظت سے اللہ کی کس خاص صفت سے تعلق ہے۔ اس خاص صفت پر غور و فکر

کرنے سے معرفت وحکمت حاصل ہوتی ہے۔ صفاتِ الٰہی قرآنی مضامین کی شاہ کلید کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کے ان مقامات کو بہ نظرِ تامل دیکھیں جہاں روزہ، نماز جمعہ، حج یا ایسے ہی دوسرے عبادات کا حکم دیا گیا ہے۔ تو دیکھیں گے کہ ان کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ اس طرح ہم ذکر کے وسیع تر معنی سے آشنا ہوتے ہیں۔ زبان سے ذکر ادنیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ دل سے ذکر اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ذکر ہے جو انسان کو اپنی یاد سے فراموش کر کے ذکرِ حق کے ساتھ وابستہ و زندہ کر دیتا ہے۔ یہ ذکر عملاً ذاکر کے جملہ افعال سے ظاہر ہوتا ہے، اور امر کی بجا آوری یا نواہی سے اجتناب۔ گھر کے معاملات ہوں یا حکومت کے قوانین۔ معاش ہو یا اقتصاد۔ شعر ہو یا ادب۔ غرض زندگی کی ہر حالت اور کیفیت سے۔ یہ ذکر۔ یہ عشق۔ حیاتِ جاودانی بخشنے کی قوت رکھتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فلسفۂ وحدۃ الوجود نے جس کے بانی شیخ محی الدین ابن العربی ہیں اسلامی دنیا کے عوام و خواص پر زبردست اثر ڈالا۔ یہ فلسفہ پورے عالم اسلام کے صوفیاء میں رائج ہو گیا اور چودھویں صدی عیسوی میں تو اسلامی شاعری کا مقبول ترین موضوع رہا۔ جو لوگ حلول اور خدا کی تجسیم کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ خدا کے ساتھ زیادہ جذبے سے محبت کر سکتے ہیں۔ اور ان کی آخری منزل خدا سے وصل یا اتحاد ہے۔ مگر قرآن صاف کہتا ہے کہ خدا خدا ہے۔ بندہ بندہ۔ بندہ خدا سے انتہائی قرب حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا اتحاد کا نظریہ کفر اور زندقہ ہے۔ یہ فلسفہ اخلاق کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اور انفرادی عمل کی ذمہ داری بے معنی ٹھہرتی ہے۔ وحدۃ الوجود پر مبنی شعر و ادب نے جوشِ عمل کو سرد کیا۔ اور انسانوں کے اندر انفعالیت پیدا کی۔ ان کو جھوٹے مرغوبات میں مست رکھا۔ میدانِ عمل سے گریزاں انسانوں نے اس کے دامن میں پناہ لے کر میٹھے خواب دیکھے۔ قرآن خدا کی ایک ذات کا تصور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادًا یحبونھم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حبًا للہ۔ (البقرہ ۱۶۵)

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہئے۔ حالاں کہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔"

فن انسان کی ان مساعی پر موقوف ہے جو وہ زندگی کے حقائق سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کرتا ہے۔ یہ بات قرینِ عقل نہیں کہ بڑے بڑے فن کاروں نے اپنی کوششوں کو صرف اس امر پر منحصر رکھا ہو گا کہ ان کے ذریعے تفریحِ طبع کا

سامان بہم پہنچایا جائے۔ یا ذہنی بازی گری یا لہو لعب میسر آئے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے کارنامے نوع انسانی کی تھکتی ہارتی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے اور تازگی اور قوت بخشنے کے لئے تھے۔ تمام فن کا مقصود حسن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ترفع کے ذریعے یا ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف رجوع کرنے سے درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان محسوسات ہی کے دائرے میں رہ جائے تو علم جہل آمیز ہو کر حجاب اکبر بن جاتا ہے۔ مکمل جمال و جلال کی حامل صرف ذات خداوندی ہے اور اسی کے جمال و جلال کی طلب اولیٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے اور تمام علوم و فنون کا مقصود زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ قرآن کی زبان میں وہ عبادت ہے۔ عبادت میں حب الٰہی بھی شامل ہے اور مخلوق خدا سے محبت بھی۔ اس طرح عشق ایک رہبر قوت ہے وہ انسان کو میدان عمل میں سرگرم رہنا ہے۔ اس کو تخلیقی کاموں میں لگاتا ہے اور تسخیر فطرت کا سبق دیتا ہے یہ عشق ماسوا اللہ کا ابطال کرتا اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنا سکھاتا ہے۔ عشق کا حلقہ بگوش دنیا ترک نہیں کرتا مگر دنیا پرستی سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ وہ مال و متاع دنیوی کی ہوس نہیں رکھتا۔ بلکہ آزادی اور بے نفسی پر جان دیتا ہے۔ اس کے دوسرے معاون اوصاف ہیں۔ صبر، توکل، نیاز، فقر، شجاعت رواداری وغیرہ وہ اوصاف جو دنیا پرستی کے مقابلے میں انسانی خودی کو آزادی اور پاکیزگی عطا کرنے والے ہیں۔

صحیح روحانی زندگی ہر فرد بشر کے لئے ایک سا ہے۔ عملی زندگی میں تقسیم کار کے اصول رائج ہونے سے پہلے شاید عملی زندگی بھی سب انسانوں کے لئے یکساں تھی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (البقرہ ۲۱۳)

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلاف رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق نہیں بتایا گیا تھا۔ نہیں۔ اختلافات ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا گیا تھا انہوں نے روشن ہدایت پا لینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے۔ کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے"

اس امر کو شدت سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ دانشور اور عوام دونوں ہی انسان ہیں اور

ایک ہی خاندان کے افراد۔ مذہب ہی وہ میدان ہے جس میں وہ ایک مشترک مقصد کے لئے سرگرم کار ہو سکتے ہیں۔ البتہ ادیب اور شاعر کے لئے ایک داعیانہ جذبہ ضروری ہے۔ جس سے اسے کارکردگی کی مقصدیت حاصل ہو۔ وہ اپنے قلم کو حق کی امانت سمجھے اور قلم کے ذریعے عبادت کرے۔ تاریخ شعر و ادب گواہ ہے کہ عظیم فن وہاں پھولتا پھلتا ہے جہاں مذہبی اور ثقافتی روایات موجود ہوں۔ جو ادب اپنی تاریخ سے منحرف ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کا عظیم ہونا تو خارج از بحث ہے۔ فن کار کے لئے دروں بینی ضروری ہے۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہے یا فن کار کائنات اور مخلوق سے کٹ کر اپنی خودی میں کھو جائے۔ یا حقیقت مطلق سے براہ راست اپنے باطن کی گہرائیوں میں ایک تعلق پیدا کرے۔ پہلی قسم کی دروں بینی منفی ہے اور علیحدگی پسند اور دوسری مثبت ہے اور وجدانی جو فن کار مذہب سے روشنی حاصل نہیں کرتے وہ قرآن کے ارشاد بغیا بینہم کے مصداق ہیں۔ ان کی کوششیں انتشار، فساد اور تباہی کا باعث ہیں۔ قرآن ان کی اور ان جیسے گمراہوں کی مثال یوں بیان کرتا ہے۔

مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا فلما اضاءت ماحوله ذهب الله بنورهم وترکھم فی ظلمٰت لا یبصرون ٥ صمٌّ بکمٌ وھم لا یرجعون ٥ اوکصیبٍ من السماءِ فیه ظلمٰتٌ و رعدٌ و برق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت ط واللہ محیطٌ بالکٰفرین ٥ یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیه واذا اظلم علیھم قاموا ط ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم وابصارھم ط ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیرٌ (البقرہ)

"ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔ اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں۔ اندھے ہیں۔ یہ اب نہ پلٹیں گے یا پھر ان کی مثال یہ سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا، کڑک اور چمک بھی ہے یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور تک چلتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

یہ بیان تاریخ کے ہر دور میں ہر طبقے کی گمراہی پر صادق آتا ہے۔

تمام علوم و فنون اور مظاہر تہذیب کو باہم متحد رکھنے کے لئے ایک مرکزی نقطہ درکار ہے وہ نقطہ اللہ ہے

اس نقطے پر انسانیت کا جمع ہونا حق ہے۔ یہی مرکزی نقطہ آج مغربی اقوام اور ان کی متبع قوموں نے کھو دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ گھر، بازار، منڈی غرض ہر جگہ فساد کا شکار رہیں۔ اور انسانی زندگیاں تباہ ہو رہی ہیں۔ اب تو تباہی کا دائرہ بے اندازہ وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ آج ہر دانشور، شاعر اور ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ حالات کی سنگینی کو محسوس کرے اور اعصابی ہیجانات پیدا کرنے والے مادہ پرستی پر مبنی ادب کی تباہ کاری کو بھی محسوس کرے۔ دنیا کی موجودہ حکومتیں بھی اپنے عوام کے حالات بگاڑنے کی ذمہ دار ہیں جنہوں نے عوامی ذرائع ابلاغ کو گھر گھر پہنچا دیا ہے تاکہ اس طرح حاکم شخصیتوں کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اور عوام پر ان کی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو سکے۔ وہ ایسے ہی علمی، تہذیبی اور تعلیمی پروگرام پیش کرتے ہیں جن سے ان کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ایسے دانشور بھی ان کے کاموں میں معاون بنتے ہیں جنہیں آزادیٔ ضمیر و فکر سے زیادہ دنیاوی مفاد عزیز ہوتے ہیں۔ ادب و شعر کو بھی مرکزی نقطہ دینا چاہیے۔ آج کی دنیا میں بغیر ایمان و یقین کے قلم چلانا گمراہی انسانیت کی تباہی میں معاون بننا بھی ہے۔

مجذوب فرنگی نتشے نے کہا تھا:۔

"خدا کہاں ہے؟ میں بتاؤں۔ ہم نے اس کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اور تم نے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں لیکن ہم نے یہ کام کیسے کیا؟ کیسے ہم سمندر پی گئے؟ کس نے ہمیں اسفنج دیا جس سے ہم نے سارا افق مٹا دیا؟ آخر ہمارا کیا منشا تھا کہ ہم نے زمین کو اس کے سورج کی زنجیر سے علیحدہ کر دیا۔ اب وہ کدھر جا رہی ہے۔ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہر سورج سے دور۔ کیا ہم مسلسل گرتے نہیں جا رہے ہیں۔ کبھی پیچھے کبھی آگے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔ ہر طرف۔ کیا اب بھی ہم فرش و عرش کی بات کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اب آوارہ گرد نہیں ہیں؟ راہ گم کردہ۔ ایک عدم کے سمندر میں غرقاب۔ کیا رات نہیں آ گئی۔ اور کیا ظلمت ہر آن بڑھتی نہیں جا رہی؟ خدا مر گیا۔ اب وہ زندہ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے مار ڈالا مگر ہمیں کونسی راحت ملی۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ جس کے بوجھ تلے ہم دب گئے ہیں۔"

نتشے عیسائیت کی دشمنی میں اس قدر بڑھ گیا کہ اپنے تیز و تند افکار کو اس نے انتہا پسندی کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ ورنہ اس کا دل صاف تھا وہ ان اخلاقی اور روحانی قدروں کی تباہی کا ماتم کر رہا تھا۔ جس کو بغیا م بنیہم والوں نے بیدردی سے پامال کر دیا تھا جب اس نے مندرجہ بالا سطور لکھیں۔ ایک دوسری عالمگیر جنگ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اور اب نیوکلیسائی اسلحے اور دیگر لاتعداد تباہ کار ہتھیار نوع انسانی کو کرہ ارض سے مٹا ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ چاند پر انسان کے قدم جا چکے ہیں۔ اور شاید اب "ستاروں کی جنگ" دور نہیں۔ آج ہمیشہ سے زیادہ قرآن کا یہ صاف حکم دنیا کو سنانے کی ضرورت ہے اور (باقی ط۳)